وفاقی شرعی عدالت نے بینک انٹرسٹ کو سود اور حرام قرار دیتے ہوئے حکومت کو مہلت دی کہ وہ چھ ماہ کے اندر ملکی معیشت سود سے پاک کردے۔اس فیصلے کے بعد حکومت نے تاخیری حربے استعمال کرتے ہوئے سپریم کورٹ میں اس فیصلے کے خلاف اپیل دائر کردی۔اس اپیل کی سماعت کا موقع ۲۳ دسمبر ۱۹۹۹ء کو آسکا،عدالت عظمیٰ نے ۱۹۹۱ء کے فیصلے کی نہ صرف توثیق کی بلکہ حکومت کو ۳۰ جون ۲۰۰۱ء تک کی مہلت بھی دی، یہ مدت ختم ہونے کو آئی تو ایک سرکاری بینک یو بی ایل کے ذریعے مزید مہلت طلب کی گئی، یہ مہلت ختم ہونے کے بعد جون ۲۰۰۲ء میں وفاقی شرعی عدالت کے ۱۹۹۱ء کے فیصلے کو کالعدم قرار دے دیا گیا۔وہ دن اور آج کا دن ہے کہ سود کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا جاسکا ہے۔ملکی معیشت جوں کی توں سودی نظام پر چل رہی ہے۔سرمایہ دارانہ نظام کا ایک چکر ہے جو امیر کو امیر تر اور غریب کو غریب تر بنا رہا ہے۔عالمی مالیاتی اداروں سے بھاری سودی قرضے لیے جاتے ہیں۔ان سودی قرضوں کی واپسی کے لیے غریب عوام پر ٹیکسوں کا بوجھ لاد دیا جاتا ہے۔دوسری طرف طاقت ور اشرافیہ بینکوں سے بھاری قرضے لے کر معاف کرالیتی ہے،اس ''معافی'' کا بوجھ بھی غریب عوام پر ڈالا جاتا ہے۔کوئی بھی صاحب ایمان شخص سودی کاروبار نہیں کرنا چاہتا،لیکن سرمایہ پرستوں کا ایک چھوٹا سا گروہ اس شیطانی گھن چکر کو چلانے پر بضد ہے۔

وفاقی شرعی عدالت کے چیف جسٹس صاحب اگر اس پہلو سے ہی غور فرمالیتے تو انہیں بینک انٹرسٹ کے حوالے سے کسی قسم کا اشکال نہ ہوتا۔یوں بھی اگر جسٹس تنزیل الرحمٰن مرحوم کا سود کے خلاف دیے گئے فیصلے کا مطالعہ کرلیا جاتا تو اُن کی کافی تشفی ہوجاتی۔بہرحال اسلامی جمہوریہ پاکستان میں ایک معزز اور باوقار منصب پر بیٹھے شخص کے سود کے بارے میں ذکر کردہ ریمارکس ناقابل توجیہ ہیں۔ان کے ذاتی خیالات جو بھی ہوں،آئین کی رو سے وہ قرآنی احکام کے مطابق فیصلہ دینے کے پابند ہیں۔سود کی شناعت وقباحت اظہر من الشمس ہے،صرف قرآن وسنت میں نہیں بلکہ دیگر مذاہب میں بھی اس کی ممانعت آئی ہے۔ہمارے خیال میں کم ازکم وفاقی شرعی عدالت کے منصب پر بیٹھنے والے شخص کو شرعی علوم کا ماہر ہونا ضروری ہے۔پارلیمنٹ کو ایسی قانون سازی کرنی چاہیے جو اس سلسلے میں بہتر رہنمائی کرتی ہو۔

مردان یونیورسٹی کا واقعہ... غور طلب پہلو

اپریل 2017ء کو مردان عبدالولی خان یونیورسٹی میں مشعال خان نامی ایک طالب علم کے قتل کا واقعہ پیش آیا جس پر مبینہ طور پر یہ الزام لگایا گیا کہ اس نے توہین مذہب اور توہین رسالت کا جرم کیا ہے بلکہ یہ جرم وہ کچھ عرصے سے کررہا تھا جس کی پاداش کے طور پر اشتعال میں آکر یونیورسٹی کے طلبہ نے اسے مار مار کر قتل کردیا مرنے سے پہلے اور اس کے بعد اس پر یونیورسٹی کے طلبہ کے تشدد کے مناظر کے ویڈیو سوشل میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا پر ساری دنیا نے دیکھے جس سے پاکستان کے عصری تعلیمی اداروں کی ایک بھیانک تصویر دنیا کے سامنے گئی۔

اس حقیقت میں دورائے نہیں ہوسکتیں کہ کسی بھی شخص کو محض الزام کی بناء پر سزا اور تشدد کا نشانہ نہیں ٹھہرایا جاسکتا اور اگر الزام ثابت ہوجائے اور ملزم مجرم بن جائے تب بھی اس مجرم کو سزا دینے کا اختیار صرف ریاست اور حکومت کے پاس ہوتا

ہے، کسی بھی عام آدمی کے لیے شریعت اسلام میں اس کی سرے سے گنجائش نہیں کہ وہ قانون اپنے ہاتھ میں لیکر سزا اور جزا کی تنفیذ کرے، اس طرح مُلک ومعاشرہ انارکی وانتشار کی طرف بڑھے گا اور ہر شخص قانون ہاتھ میں لے کر مُلک وملت کی وحدت اور نظم ونسق کے شیرازہ کو بکھیر کر رکھ دے گا، اس لیے مجرم کی سزا کے نفاذ کا اختیار صرف ریاست اور اس کی عدالت کے ں ہوتا ہے، یہی شریعت اور فقہائے اسلام کا متفقہ فتویٰ ہے۔ اور اس سلسلے میں کسی قسم کا کوئی ابہام نہیں ہے اس لیے یونیورسٹی کے طلبہ کا قانون ہاتھ میں لے کر مشعال خان نامی طالب علم کو قتل کرنا اور اس پر تشدد کرنا قابلِ افسوس بھی ہے اور قابل مذمت بھی، ہم لاقانونیت کی راہ اختیار کر کے قتل وتشدد کے اس واقعے کی کھل کر مذمت کرتے ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ پہلو بھی قابل غور ہے اور من حیث القوم ہمیں اس پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا ہوگا کہ ایک عام آدمی قانون ہاتھ میں کیوں لیتا ہے، وہ ملزم یا مجرم کو خود سزا دینے کی طرف کیوں بڑھتا ہے؟ اس طرح کے حساس مذہبی معاملہ میں وہ ریاست اور عدلیہ کے نظام تنفیذ، سزا وجزا پر اعتماد کیوں نہیں کرتا!... اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمارا ریاستی اور عدالتی نظام، اس سلسلے میں سست بھی ہے اور بیرونی قوتوں کے دباؤ کا شکار بھی... توہین مذہب اور توہین رسالت کے الزام میں جن لوگوں کو گرفتار کیا گیا، ہماری عدالتی تاریخ اس پر گواہ ہے کہ جرم ثابت ہونے کے باوجود انہیں سزا نہیں دی گئی، آسیہ مسیح کا کیس سب کے سامنے ہے، اس کے علاوہ گذشتہ دنوں سوشل میڈیا پر اس جرم کا ارتکاب کرنے والے بلاگرز بھینسا وغیرہ ناموں سے توہین رسالت کرنے والے ملزموں کو ریاستی اداروں نے پکڑا اور چند دن کے بعد انہیں سزا دیئے بغیر چھوڑ دیا، اس سلسلے میں اسلام آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس جناب شوکت عزیز صاحب کے ریمارکس ساری قوم نے پڑھے اور انہوں نے ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے اپنا درددل قوم کے سامنے رکھا، وزیر داخلہ چوہدری نثار علی خان صاحب نے بھی میڈیا کے سامنے اپنے ایمانی جذبات کا اظہار کیا لیکن مجموعی لحاظ سے قانون پر عمل داری کی صورت حال اطمینان بخش نہیں، اس لیے اس طرح کے حساس اور جذباتی مذہبی معاملہ میں کئی لوگ ریاستی قانونی راستے کو ترک کر کے خود قانون کو ہاتھ میں لے لیتے ہیں اور لاقانونیت کی راہ پر چل پڑتے ہیں...... ہمیں من حیث القوم اس سلسلہ میں اپنے عدالتی نظام کو آزاد، فعال اور قانون پر عمل داری کی صورت حال کو اطمینان بخش بنانا ہوگا، بعض لبرل قسم کے دانش ور اس موقع پر توہین رسالت کی سزا والے قانون کو ختم کرنے کا مشورہ دے رہے ہیں حالانکہ اس کا حل قانون کو ختم کرنا نہیں، قانون پر عمل داری کو شروع کرنا ہے، اس قانون پر عمل داری کا نظام جس قدر فعال اور مضبوط ہوگا، جس قدر شفاف اور اطمینان بخش ہوگا، اسی قدر اسی طرح کے واقعات کی پیش بندی ہو سکے گی۔

اس حوالہ سے ایک غور طلب پہلو یہ بھی ہے کہ توہین مذہب اور توہین رسالت کا الزام لگا کر قانون ہاتھ میں لینا جرم ہے اور، لاقانونیت بھی جرم ہے اور توہین مذہب ورسالت بھی جرم ہے، دونوں طرح کے مجرموں کو سزا ہونی چاہیے اور ں میں پورا پورا عدل وانصاف اور شفافیت ہونی چاہیے (باقی صفحہ نمبر ۴۳)